ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.2 2021

" مجلہ ہمایوں "اور ترقی پسند تحریک

عبدالرسول ارشد(پی ایچ ڈی اسکالر)
پی۔ایچ۔ڈی سکالر لاہور، گیریژن یونیورسٹی لاہور
عامرہ رسول
استاد شعبہ اردو لاہور، گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین دبئ محل روڈ بہاولپور۔

Abstract:
In the development of Urdu linguistic and literature, the Journal, Hamayoun by Bashir Ahmad and Progressive Movement played an extraordinary role in the history. The most Progressive thought organization of Bashir Ahmad, Ahmad Nadeem Qasmi, Saif-ud-Din Saif, Zaheer Kashmiri, Sahir Ludhiyanvi, Krishan Chandar, Mantu, Rajindar Singh Baide, Yousaf Zafar, Salam Machli Shehri, Akhtar Ansaare, Majaz, Firaq, Qateel Shifai, Shad Aarfi, Opandar Nath Ashk, Abu Saeed, Aziz Ahmad, Khuaja Ahmad Abbas, Balwant Singh, Devandar Sthyaathi, Ibrahim Jalees, etc. are tinted and an effort is made to well-founded the positive philosophical features of writers and also spawn and determination to exclusivity the accurately and ancient participation of Journal, Hamayoun, it has also described the important features of Progressive Movement. In this essay the character and relative between Progressive Movement, Hamayoun and above personalities. Additionally mythical contribution of Hamayoun linked to Progressive Movement is being define in the earliest perception.
Key Words: Linguistic, Progressive, Determination, Spawn, Mythical Contribution

کلیدی الفاظ: لسانی، ترقی پسند، عزم، جنم دینا، افسانوی، شراکت

ملخص:
اردو لسانی وادب کی ترقی میں بشیر احمد کے جریدے ہمایوں اور ترقی پسند تحریک نے تاریخ میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ ترقی پسند فکر کی تنظیم میں بشیر احمد، احمد ندیم قاسمی، سیف الدین سیف، ظہیر کشمیری، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، یوسف ظفر، سلام مچھلی شہری، اختر انصاری، مجاز، فراق، قتیل شفائی، شاد عارفی، اپندر ناتھ اشک، ابو سعید، عزیز احمد، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، دیوندر ستھیار تھی، ابراہیم جلیس وغیرہ کے شامل ہیں اوران مصنفین کی ثبت فلسفیانہ خصوصیات کو اچھی طرح سے قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جرنل، ہمایوں نے عزم ،استقلال سے ترقی پسند تحریک کے مصنفین کو اپنے اندر سمویاہے ۔ اس مضمون میں ترقی پسند تحریک "ہمایوں" درج بالا شخصیات کے درمیان ایک کردارادا کیا ۔ترقی پسند تحریک سے منسلک ہمایوں کی افسانوی اور شاعری شراکت کو ابتدائی تصور میں بیان کیا جارہا ہے۔

ترقی پسند تحریک ایک ایسی تحریک تھی جو عالمگیریت اور کشادگی پر مشتمل تھی اور یہ اس وقت کے حالات وواقعات کا ردعمل تھا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء کے دوران میں روس کے نئے نظام کی تشکیل اور فسطائی طاقتوں کے سر اٹھانے کے نتیجے میں یہ تحریک پیدا ہوئی۔ اس تحریک کا اثر ہندوستان کے ادیبوں پر بھی ہوا۔ ممتاز شیریں نے ترقی پسند ادب کی تعریف یوں کی ہے۔

"وہ ادب جو زندگی کو اپنے حقیقی روپ میں پیش کرے جس میں زندگی کی تفسیر ہی نہیں تنقید بھی ہو اور جس میں زندگی کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہو۔"[۱]

ادب کسی بھی معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اس کے علاوہ یہ معاشرے میں تبدیلی لانے کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ افلاطون کے مطابق شاعری صرف حقیقت کی نقالی ہے اس لیے انسان کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے شاعروں کو خیالی دیپک سے باہر کر دیا۔ ارسطو نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ شاعری تخیل کے ذریعے فطرت کے امکانات کی نئے سرے سے تعمیر کرتی ہے اور اس طرح داخلی طور پر انسان کو تبدیل کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔ شاعر کا مقصد اس کے اندر موجود غم کو پوری شدت سے ابھار کر روح کو پاک کرنا ہے۔ ارسطو نے اس کے لیے یونانی لفظ کیتھارسس استعمال کیا۔ ٹیگور کے الفاظ میں:

"تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے جو حق اور جمال کی تلک کرتا ہے تو پہلے کی کینچلی کو انار کلی کی طرح سخت ڈھنل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے۔ روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔ جو ادیب داخلی طور بھی اپنی آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ کس منہ سے ادب کی آزادی کی بات کر سکتا ہے اور خارجی آزادی کا مطالبہ کر سکتا ہے دراصل یہیں سے ادب اور سماج کا رشتہ آپس میں موجود ہوتا ہے اور ادب میں ترقی پسندی کا رجحان داخلی ہوتا ہے۔"[۲]

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.2 2021

کرشن چندر کے مطابق:

"ترقی پسند ادب کا مرکز "مزدور" ہے۔ گو ابھی تک بہت سے ادیبوں کے نزدیک ترقی پسند ہونے کی نشانی یہ ہے کہ مزدور سے ایک موہوم جذباتی سا رشتہ پیدا کیا جائے ایک نہایت سطحی قسم کی ہمدردی سے کام لے کر اپنے کام یا افسانوں یا ڈراموں کے اندر مزدور کے لئے جذبہ ترحم پیدا کیا جائے اور حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مزدوران سے کسی قسم کی "پدرانہ شفقت" اور رحم کا طالب نہیں ترحم کا جذبہ خالصتاً ہوژوائی ہے۔"[۳]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب جاگیر دارانہ نظام کا خاتمہ ہوا۔ اس نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی درباری قسم کا ادب بھی ختم ہونا شروع ہوا۔ اس وقت ترقی پسند ادب کا آغاز ہوا۔ درباری نثر جو تکلف پر مبنی تھا اور جس میں درباری ٹھاٹ باٹ موجود تھی رفتہ رفتہ ختم ہونا شروع ہوا اور سادہ اور عام فہم ادب کی بنیاد پڑی۔ غزل کی بجائے نظم کہی جانے لگی۔ اُردو ادب کے دائرے کو وسیع کرنے میں اقبال، سر سید اور حالی نے بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۳۵ء تک اُردو ادب میں بہت زیادہ وسعت پیدا کی گئی۔ اُردو ادب نے ستر اسی سالوں کے عرصے میں جتنی ترقی کی اس سے پہلے کبھی اتنی اترقی نہیں ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات تھے۔ اپنی زبان جس کا ادب غزل، مثنوی، قصیدہ اور چند تذکروں کے سوا کچھ نہ تھا ترقی پا کر نظم، افسانہ، ناول، سوانح، تاریخ اور تنقید تک پھیل گیا۔ اُردو ادب عشقیہ داستانوں سے نکل کر ایک عظیم ادب کے راستے پر گامزن ہو گیا۔ ۱۹۴۰ء تک اس تحریک میں اس زمانے کے نمائندہ، ادباء اور شعراء بھی شامل ہو گئے جس کی وجہ سے اس تحریک میں بہت زیادہ شدت پیدا ہو گئی۔ ملک میں جاری تحریکوں سے کوئی بھی پرچہ اپنا دامن نہیں بچا سکتا اس لیے "ہمایوں" کے ۱۹۴۰ء کے شماروں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں نے بھی ترقی پسند تحریک کی ترجمانی کی ہے۔ اس طرح ہمایوں نے ترقی پسند تحریک کی ترقی اور اس کو آگے بڑھانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۴ء کے شمارے میں مدیر ہمایوں لکھتے ہیں:

"اہل سائنس کہتے ہیں کہ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا توہمات کا عہد گزر گیا اب عقل اور تجربے کا زمانہ ہے لیکن بد قسمتی سے یہ عقل اور یہ تجربے بھی ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ پھر کیا کیا جائے؟ پرانا مذہب اب بہت پرانا ہو چکا۔ نئی سائنس نے بڑھ بڑھ کر قدم مارے اور اپنی حد سے بہت آگے نکل گئی۔ پس اب ہمیں اس مذہب کی ضرورت ہے اور اس سائنس کا انتظار ہے جو عطا نوع انسان کو ایک برادری سمجھے اور قوموں کی عصبیت کو کم کرے جو مادیت اور روحانیت کے امتیاز کو مٹا دے جو ایک طرف انسان کو بے باک اور خود دار ہونا سکھائے اور دوسری طرف اس کے دل میں صحیح قسم کا انکسار و ایثار پیدا کر دے۔ ہمیں اب وہ عقل درکار نہیں جو فقط لفظی بحثیں کرے وہ ایمان درکار نہیں جو فقط زبانی اقرار کرے۔ ہم اب نہیں چاہتے کہ صرف کسی ایک ملک کے فدائی بنے رہیں۔ اس لئے کہ اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم دنیا کے شہری اور کائنات کے باشندے ہیں۔ ہم کالے گورے کے فرق کو، غریب امیر کے فرق کو، مشرق و مغرب کے فرق کو غیر فطری مصنوعی اور وحشیانہ سمجھتے ہیں۔"[۴]

مندرجہ بالا اداریوں سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ تمام نظریات کو پیدا کرنے میں ترقی پسند تحریک کا بڑا کردار ہے۔ اس تحریک نے پہلی مرتبہ بین الاقوامیت کا تصور لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کیا۔ ہندوستان کے بسنے والے صرف یہ نہ خیال کریں کہ وہ صرف ہندوستانی ہیں بلکہ یہ خیال کریں کہ وہ عالمی برادری کا حصہ ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقاصد یہ ہیں۔

"ہماری انجمن کا مقصد ادب اور آرٹ کو ان رجعت پذیر طبقوں کے چنگل سے نجات دلانا ہے جو اپنے ساتھ ادب و فن کو بھی انحطاط کے گڑھوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی ادیبوں کو چاہیے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنس عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسند تحریکوں کو ہدایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو رواج دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشوونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔" [۵]

یہ منشور ہمیں ہمایوں کی تحریروں سے حاصل ہوتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہنی طور پر اس تحریک نے ان پر بھی اپنا اثر دکھایا۔ اب ہمایوں نے ایسی تحریروں کو جگہ دینے کا آغاز کیا جو ترقی پسند تحریریں تھیں۔ اس میں حصہ لینے والے شعراء اور ادباء میں ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی، یوسف ظفر، سیف الدین سیف شامل ہیں۔ اگر ادبی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے جہاں ہندوستان کی دوسری زبانوں نے اثر قبول کیا وہاں اردو بھی متاثر ہوئی۔ ترقی پسند تحریک مجموعی طور پر اشتراکی نقطہ نظر کی تحریک ہے۔ یہ تائید کرنے کے ساتھ ساتھ ترجمانی بھی کرتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے قبل اردو ادب کے مزاج میں سیاسی اور سماجی شعور کا عمل دخل ہے۔ حالی، آزاد اور اقبال کے ذہنوں میں ان تحریکات کے نقوش واضح ملتے ہیں۔

سلام مچھلی شہری کی نظموں میں نیا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی ایسی نظمیں جو ہمایوں کی زینت بنی ہے ان میں طرز فکر کی انفرادیت سے جداگانہ شناخت دیتی ہیں، البتہ ان کے ذہنی انتشار کی وجہ سے انہوں نے بھانت بھانت کی نظمیں تحریر کی ہیں لیکن یہ نظمیں مرکزیت پیدا نہیں کر سکیں اور نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے کلام میں بے ساختگی اور تکنیک موجود ہے۔ ہمایوں میں شائع ہونے والی سلام مچھلی کی نمائندہ نظمیں اندیشہ، مئی ۱۹۴۲ء، موضوع کی تلاش مارچ ۱۹۴۱ء، ایک سال، جولائی ۱۹۴۲ء، شام، مئی ۱۹۴۳ء، اسپیشل ٹرین، نومبر ۱۹۴۳ء، معاف اے عروس صبح، جولائی ۱۹۴۵ء، سہارے احساسِ کمتری کے، نومبر ۱۹۵۲ء، ذکر اس پری روش کا، فروری ۱۹۵۳ء، تحفہ، جولائی ۱۹۵۳ء، انار کلی، مارچ ۱۹۵۴ء، تنہائی ستمبر ۱۹۵۴ء وغیرہ ہیں۔

اختر انصاری کے بارے میں عندلیب شادانی نے "ساقی" میں ایک مضمون جس کا عنوان "ایک تابناک ستارہ" تھا اس میں انھوں نے لکھا کہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.2 2021

"اختر انصاری کی غزلوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ تغزل کے تمام آداب کو برتتے ہوئے روایتی غزل گوئی کی یکسانیت اور باسی پن کے شکار نہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے ان کی بنیاد خود ان کے اپنے محسوسات ہیں۔ اس لیے ان میں تاثیر اور دلکشی ہے۔" [۶]

اختر انصاری معاشرتی عمرانی وسیاسی مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی طبیعت انقلاب اور بغاوت کی طرف مائل نہ ہوئی۔ اسی وجہ سے انہوں نے خارجی حقائق کا مطالعہ ان کے سماجی تجزیہ کو اپنا موضوع بنایا۔ ہمایوں میں ان کی نظمیں شائع ہوئی ہیں ان میں شہب بہار، فروری ۱۹۳۱ء، مغنیہ، اکتوبر ۱۹۳۲ء، سحر نغمہ، دسمبر ۱۹۲۹ء، فریب نغمہ، دسمبر ۱۹۳۲ء وغیرہ ہیں۔ اختر انصاری کے کلام میں حزن، غم کی لہر موجود ہے۔ بقول احسن کلیم:

"ایک ایسی روح کا ارتعاش ہے جس نے غم کو ہضم کر لیا ہے۔" [۷]

اسرار الحق مجاز کا شمار ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے جنہیں ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں عروج ملا۔ بقول عزیز احمد:

"مجاز کی شاعری انقلاب اور تغزل کا حسین ترین امتزاج ہے۔" [۸]

اعجاز کی ابتدائی شاعری میں انقلاب نظموں میں جوش، غزلوں پر عزیز لکھنوی فانی کے اثرات ملتے ہیں۔ بعد کے کلام میں ان کا لہجہ تبدیل ہو گیا، نہ ہی عزیز اور فانی کے لہجے کا اضمحال، ان کے مزاج میں عرفی کا تیور اور کلام میں تغزل کا رنگ کی مماثلت حافظ جیسی ہے۔ جعفر علی خان ناصر نے ایک بار کہا تھا کہ

"اردو شاعری میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے ترقی پسند بھیڑیے اٹھا کر لے گئے۔" [۹]

مجاز کی نمائندہ نظم آوارہ، مارچ ۱۹۵۶ء جو ہمایوں میں چھپیں جو کہ جدید اردو کے حریم میں داخل ہوئی ہیں بقول اختر انصاری:

"مجاز کی یہ غنائی اور جذباتی شاعری کوئی سطحی ادنیٰ قسم کی شاعری نہ تھی اس میں جذبات نگاری تو ہے مگر سستی جذبہ فروشی اچھی یا رکیک عشق بازی اور بیمارانہ لذت پسندی کے اثرات سے بالکل پاک ہے۔" [۱۰]

احتشام حسین کے خیال میں:

"ان میں رومانی وفور ہے لیکن ایسی جذباتیت نہیں ہے جو حقیقت کی نفی کرتی ہو۔" [۱۱]

احتشام حسین کہتے ہیں:

"رومانیت مجاز کو ترقی سے روکنے والا عنصر نہیں پرواز کرنے والا عنصر بن جاتا ہے۔" [۱۲]

فیض نے آہنگ کے دوسرے ایڈیشن پر دیباچہ جو تحریر کیا ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ

" اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں، باغی کے دل کی آگ نہیں، نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ بیچ کی ایک مختصر مدت کے علاوہ وہ ہمیشہ سے گاتا رہا ہے۔ اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی لیکن آہنگ میں فرق نہ آیا۔ "

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"اس کی غنائیت تمام غنائی شعرا سے مختلف ہے۔ عام غنائی شعرا محض عنفوان شباب کے دو چار محدود ذاتی تجربات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں میں لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان تجربات کی تحریک ان کی شدت اور قوت نمو ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام غنائی شعرا کی شاعرانہ عمر بہت کم ہوتی ہے۔ ان کا اوسط سرمایہ دس پانچ کامیاب عشقیہ نظمیں ہوتی ہیں بعد میں وہ عمر بھر انہیں دہراتے رہتے ہیں یا خاموش ہو جاتے ہیں۔ مجاز کی غنائیت زیادہ وسیع، زیادہ گہرے، زیادہ مستقل مسائل سے متصل ہے۔ اس کے شباب میں بڑھاپے کا رنگ نہیں جھلکتا۔ مجاز گرم زندگی کے نشے سے چور اور موت کے سرد جمود سے بیزار ہے۔" مجاز کی انقلابی شاعری کے بارے میں فیض لکھتے ہیں: "عام انقلابی شعرا انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ ان کے ذہن میں عام طور پر انقلاب کا تصور طوفان برق و رعد سے مرکب ہے۔ نغمہ ہزار اور رنگین بہار سے عبارت نہیں۔ وہ صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں، اس کے حسن کو نہیں پہچانتے۔ یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پرست تصور ہے۔ یہ برق و رعد مجاز پر بھی گزر چکا ہے (انقلاب سرمایہ داری وغیرہ) لیکن اب مجاز کی غنائیت اسے اپنا چکی ہے۔ مجاز انقلاب ڈھنڈورچی کا مطرب ہے۔ اس کے نغمہ میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثر آفرینی ہے۔" [۱۳]

مجاز نے جو موضوع کا انتخاب کیا ہے وہ رومانی طرز کا ہے۔ اس کے دورِ انتشار کی نمائندہ نظمیں بھی ہمایوں کی زینت بنی ہیں۔

"احمد سرور نے مجاز کو رومانیت کا شہید لکھا ہے اور یہی ان پر سب سے زیادہ موزوں تنقید ہے۔ " [۱۴]

مجاز کے کلام میں گیرائی اور گہرائی موجود ہے جو اسے اپنے ہم عصر ادباء سے ممتاز کرتی ہے اور آنے والے ادباء کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ حسن عسکری لکھتے ہیں:

"بعض دفعہ ادیب ایسی چیز بھی لکھ جاتا ہے جس کی اہمیت خالص ادبی قیمت کے ماوراہوتی ہے۔ مثلاً وکٹر ہیوگو کا ناول "لے مرزایل" یا روس میں رولاں کا "ژان کرستاف"۔ ان کتابوں میں ادبی اعتبار سے بیس خرابیاں نکالی جا سکتی ہیں مگر اس کے باوجود اپنے زمانے کے ادبی رجحانات کی نمائندگی

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.2 2021

کرنے کی وجہ سے Myth کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔یہی حال مجاز کی بعض نظموں کا ہے۔ان نظموں کی بدولت مجاز ادبی تاریخ کو لگ رہی ہے۔

ہماری سماجی تاریخ میں داخل ہو چکے ہیں۔مجاز اپنے پیچھے ایک ایسا افسانہ چھوڑ گئے جو آسانی سے نہیں مرے گا۔" [۱۵]

فراق گورکھپوری کو ترقی پسندوں کے دور میں شہرت ملی۔فراق نے شاعری میں ایک لب ولہجہ، کیفیت اور ایک نئی آواز کو متعارف کرایا۔ان کی شاعری عشق ومحبت، فطرت اور جمالیات کے دائرہ میں ہے۔ترقی پسند نظریات کا اثر ان پر کتنا رہا،اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ

"جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا نصب العین بھی سمجھ میں آنے لگا۔۱۹۳۶ء کے بعد سے متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔اشتراکیت کے فلسفے میں عمل کے جو معنی ہیں وہ گزشتہ تاریخ کے عمل کے فلسفوں سے مختلف ہیں۔اب میری کوشش نظموں میں یہ ہونے لگی کہ مسائل کو عالمگیر انسانیت کے ارتقاء کی روشنی میں پیش کروں۔ محض متکیف ہونا زندگی جیسی ہے۔اس سے متاثر ہونا قومی کلچر اور قومی مزاج کے تصور پر وجد کرنا اسے اب میں ناکافی سمجھنے لگا۔اب دنیا اور زندگی پر راج کرنے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدل دینے کا تصور میرے اندر کارگر ہونے لگا۔ پھر بھی مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے اور جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اسے شعوری اور وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی ہے۔میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جاسکتا کن کن سے میرے تعلقات ہیں۔ان تعلقات کو میں نے کس طرح ہضم کیا ہے۔جنسیت کو کتا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں۔ جنسی پاکیزگی تعلق سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس تعلق کو وجدانیت اور جمالیاتی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے۔"[۱۶]

ہندو فلسفہ کے مطابق فراقِ جنس کو مقدس جذبہ سمجھتا ہے۔رشید صاحب کے بقول:

"فراق کی شاعری میں جنس کا جو عمل دخل ہے اسے اس روشنی میں دیکھنے سے اس کی صحیح نوعیت سمجھ میں آسکتی ہے۔"[۱۷]

فراق کی شاعری میں ذہن کا عنصر غالب ہے۔بقول حسن عسکری:

"فراق کے یہاں بنیادی مسئلہ فراق کا ہے۔ فراق کے وہ معنی نہیں جو اکثر اردو شاعری میں ہوتے ہیں۔یعنی محبوب سے علیحدگی اس وجہ سے کہ محبوب کے رشتہ دار حائل ہیں یا محبوب جفاکار تغافل پسند ہے۔یہاں فراق کی وجہ سے دو شخصیتوں، دو فردوں کی بنیادی علیحدگی ہے۔فراق صاحب کو اس بنیادی اور عنصری فصل کا جیسا درد ناک اور پر جلال احساس ہے۔وہ اردو شاعری میں بڑا کامیاب ہے۔"[۱۸]

فراق کی غزلیں اور نظمیں جدید شاعری میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔انہوں نے اردو شاعری میں اشاریت اور علامتی اسلوب کو متعارف کروایا ہے۔عزیز احمد کا خیال ہے:

" راشد اور فیض کے بعد جدید نظم نگاری کے معیار پر صرف فراق کی نظمیں پوری اترتی ہیں۔"[۱۹]

فراق کی نظمیں جو ہمایوں میں شائع ہوئیں ان میں ہندوستانی ثقافت، فطرت سے ہم آہنگی، سیاسی اور سماجی مسائل جیسے عناصر موجود ہیں۔ فراق کی نمائندہ نظمیں نقدِ حیات ۱۹۵۳ء، رباعیات، اور کلام، ستمبر ۱۹۳۰ء، اکتوبر ۱۹۳۰ء، دسمبر ۱۹۴۵ء، اگست ۱۹۵۶ء، جون ۱۹۳۷ء، دسمبر ۱۹۵۱ء، جنوری ۱۹۵۳ء وغیرہ ہمایوں کی زینت بنیں۔

احمد ندیم قاسمی نے جہاں افسانوں میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے وہاں ان کی شاعری میں موجود موسیقیت قانون قدرت تو ہے لیکن مرکزیت ان کی شاعری میں نہیں ہے۔ ہمایوں میں یاچناں کن یا جنیں، فروری ۱۹۴۳ء، نقاب کشائی، جولائی ۱۹۳۹ء، دسمبر کی ایک رات، مئی ۱۹۳۸ء، امید کا دھارا، جولائی ۱۹۳۹ء، زاویہ نگاہ، مئی ۱۹۳۹ء، جوگن، مارچ ۱۹۳۹ء، پہلی اور آخری آرزو، اکتوبر ۱۹۳۹ء، نگاہ بلند، مئی ۱۹۴۰ء، رات اور دن، دسمبر ۱۹۴۲ء، ایک عیاش دوست کے نام ۱۹۴۳ء، آرزو کا کھیل، جولائی ۱۹۴۴ء، ابلیس رات کے سناٹے میں، اپریل ۱۹۴۴ء، پرواز کے بعد، ستمبر ۱۹۴۶ء، قیاس، جنوری ۱۹۴۷ء، گونج، نومبر ۱۹۵۲ء، راستے، سالنامہ ۱۹۵۸ء میں نظمیں شائع ہوئی ہیں۔شاد عارفی کی شاعری طنزیہ شاعری ہے اور شاعری فضا آشوب کی فضا ہے۔ان کی نظموں میں جدید مغربی اشاریت کا اثر ہے اور نہ ہی اردو نظم کی مروجہ گوئی کا۔ان کی نظموں کا موضوع معاشرتی اور سماجی مسائل سے متعلق ہے۔ان کی شاعری میں ڈرامائی، مکالماتی اور تمثیلی انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔

ٹی۔ایس۔ایلٹ نے شاعری کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے۔ان تین آوازوں کا یکجا ہونا مشکل کام ہے لیکن شاد عارفی نے اردو نظم میں یہ کام کیا ہے۔ان کے کلام میں تنوع، عمومیت، ہمہ گیری، تازگی، ندرتِ بیان اور احساس جیسے عناصر ملتے ہیں۔ ہمایوں میں ان کی نمایاں نظمیں تصادم خیال، اکتوبر ۱۹۳۲ء، جادہ کش، مارچ ۱۹۳۶ء، عورت، نومبر ۱۹۳۷ء، موسم بہار، اپریل ۱۹۴۰ء، ساون، ستمبر ۱۹۴۰ء، ساون کے بعد، نومبر ۱۹۴۰ء، بچپن سے جوانی تک، اپریل ۱۹۴۱ء، وہ اور ہم، جون ۱۹۴۱ء، اندھیر نگری، جنوری ۱۹۴۲ء، رنگیلے راجہ کی موت، اکتوبر ۱۹۴۱ء، مشورہ، دسمبر ۱۹۴۳ء، بیٹے کی شادی، جنوری ۱۹۴۴ء، پجارن، جون ۱۹۴۴ء، شادی کے بعد، اگست ۱۹۴۵ء، ساس، جولائی ۱۹۴۶ء، رت جگہ، فروری ۱۹۵۴ء، وغیرہ ہیں۔

قتیل شفائی کی شاعری میں رومانوی اثرات موجود ہیں۔ان کی شاعری میں غنائیت موجود ہے اور ان کا دائرہ فکر محدود ہے۔ان کی شاعری میں سیاسی و قومی مسائل بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ ہمایوں میں ان کی نمائندہ نظمیں حسن و عشق، مئی ۱۹۴۳ء، سفر، اگست ۱۹۴۳ء، اجلے سائے، سنہرا سپنا ۱۹۴۵ء، اونچے پربت ۱۹۴۶ء، وغیرہ شائع ہوئی ہیں۔

ہمایوں کے کردار کا اندازہ اس میں چھپنے والی نظموں سے ہو جاتا ہے۔یہ چند نظموں کی جھلک ملاحظہ فرمائیں:

"بیزار ہے کشف و کلیسا سے اک جہاں
سوداگران دین کو سوداگری کی خیر
ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبران دہر کی پیغمبری کی خیر

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.2 2021

شعلے لپک رہے ہیں جہنم کی گود سے
باغ جناں میں جلوہ حور پری کی خیر
اظہار کر رہا ہے مرتب جہان نو
تہذیب و دین کے حیلہ نارنگری کی خیر" [۲۰]

"آپ نے دیکھے ہیں عالم کے زمانے سارے
ٹوٹتے ہیں تو ابھرتے نہیں روشن تارے
ہم نے منعم کے بھیگتے ہوئے میخانے میں
بہتے دیکھے ہیں غریبوں کے لہو کے دھارے
ہم نے دیکھے ہیں سیاست کے کھلے آنگن میں
بحث و تکرار کے چلتے ہوئے ناک موں آرے
چند الجھے ہوئے الفاظ کو سلجھانے کو
بھولی ماون نے کئی راج دلارے وارے
ہم نے افکار کو پابند بنا رکھا ہے
عشق کو غم پہ رضامند بنا رکھا ہے"

"اس کو اطلس کے نرغے میں پھنسائے رکھو
اس کو تقدیر کا محکوم بنائے رکھو
کھیت پک جائیں تو دھنکار روکھے کی طرح
اگلے موسم کے تقاضوں کو لبھائے رکھو
اس کی امید پہ ظلمات کی زنجیریں ہوں
اس کے احساس کے شمعوں کو بجائے رکھو
جن کے فیضان سے مضبوط ہے بدعت کا نظام
ان روایات کا دیوانہ بنائے رکھو
یہ نہ جانے تو امیروں کا لہو گرماؤ
ورنہ خود اپنے جہنم میں بھسم ہو جاؤ" [۲۱]

"نیا نظام! ذرا مسکرا کے سوچنے دے
نیا نظام! مساوات آتشیں الفت
بہار، نغمے، امن، رقص، قہقہے انوار
مگر خدا کے مذاہب، مگر خدا کا وجود
یہ آس ہے سروپا ہے، یہ کشمکش بے سود" [۲۲]

"دھڑکنیں ساز کلیسا کی تھمی جاتی ہیں
سانس گھٹنے لگا قوس کا بت خانے میں
لٹ گیا حج مساجد کے نواؤں کا سرور
شام ہونے کو ہے اور مجھ کو حیرانی ہے

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.2 2021

صبح نو کیسے مناؤں نئے کاشانے میں "[۲۳]

مندرجہ بالا تمام نظموں سے پرانی روایات سے بغاوت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ترقی پسند ادب شاعری کے ساتھ ساتھ غزل اور نظم پر بھی مشتمل ہے۔ افسانے، ناٹک اور نوٹنکی، داستانیں اور تنقید بھی شامل ہے۔ ترقی پسند نقادوں نے تنقید کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ ادب کو مارکس کے حوالے سے دیکھا گیا۔ ان ادبا اور شعراء میں از حسین، مجنوں گورکھ پوری، اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین شامل ہیں۔ راشد اور منٹو کے ادب پر عزیز احمد نے تنقید کی۔ اس تنقید کا اثر ہمایوں پر بھی ہوا۔ اُردو شاعری کے سماجی اور معاشرتی پس منظر کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> "۱۹۱۷ء کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستانی روس کے صحیح حالات سے واقف ہوئے۔ روسی لٹریچر اور دیگر سیاسی کتابیں جو سالوں بعد بھی ہندوستان میں نہ پہنچ سکتی تھیں اس سرعت سے آئیں اور پڑھی جانے لگیں کئی روسی نظموں اور کہانیوں کے ترجمے شائع ہوئے۔ جن سے ادیبوں کو پرولتاری ادب و شعر کا اسلوب معلوم ہو گیا۔ جنگ کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ سرکاری ملازمتیں بڑھ گئیں اور وہ ذہین لوگ جو محض صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے ترقی پسند اور انقلابی شاعر ہونے کی مہریں لگائے بیٹھے تھے اور نیچے درون نیم برون کے مصداق دوغلے ادب سے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے۔ اچک کر سرکاری مسندوں پر جا بیٹھے۔ ظاہر ہو گئے ختم ہو گئے اور اُردو شاعری کافی حد تک رہزنوں کے ہاتھ سے محفوظ ہو گئی۔ ملک کے ساتھ ساتھ اُردو شعر بھی سرخ ہوتا جا رہا ہے۔" [۲۴]

اوپندر ناتھ اشک رومانوی افسانہ نگاروں سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ خاص طور پر ان کے افسانوں مجموعے "ناسور" کے تمام افسانوں میں رومانوی رنگ پایا جاتا ہے۔ اشک کے افسانوں میں گردو پیش کے سنگین مسائل کا تذکرہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اشک کے افسانوں میں اس دنیا کا نقشہ کھینچا۔ وہ لکھتے ہیں کہ کیسے ایک شہر مال غریب باپ کی بیٹی کے خوابوں کو تار تار کر دیتا ہے۔ کس طرح ایک غریب قلی بھوک مٹانے کے لیے کس طرح طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھاتا ہے اور اس طرح وہ اس دوران دم توڑ دیتا ہے۔ دراصل اشک کی توجہ محض سیاسی و سماجی حقائق کی جانب ہی نہیں رہی، اس نے نفسی حقائق کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی توجہ، جنس، کی جانب مبذول ہوئی ہے، مگر ان کا مسئلہ الذتیت نہیں بلکہ وہ کسی کردار کے اندر مچلتی آرزو کو گردو پیش کے بے تعلقی یا بے حسی کے مقابل لا کر عجیب تضاد کی تصویر بناتے ہیں۔ " موتی "نومبر ۱۹۳۸ء، زندگی مارچ ۱۹۳۹ء، میں شائع ہوئے۔

ہنس راج رہبر کے زیادہ تر افسانے پریم کے دوسرے دور کے افسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں ان کے افسانے مثالی اخلاقی کردار کی منظر کشی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں "سالگرہ اور زخم" میں سوانحی رنگ پایا جاتا ہے۔ دوسرے افسانے میں شہری روشوں پر طنز کیا گیا ہے۔ سالگرہ پر صاف "ہنس راج رہبر" جی پہنچانے جاتے ہیں جب وہ کھری کھری سنانے والے مصنف کو یاد کرتے ہیں۔ ان کے وہ افسانے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں جو ذات پات کے ساتھ سماجی امتیازات کو بھی ختم کرتے ہیں۔ مصنف کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وجہ سے ان کے افسانوں میں پائی جانے والی تلخی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ "یہ اور وہ" مئی ۱۹۴۵ء، "نیا رفیق" اکتوبر ۱۹۴۵ء، "فاصلہ" فروری ۱۹۴۷ء، "کنڈھیا" جنوری ۱۹۴۶ء۔

اختر انصاری کے افسانوں میں مزاح اور سادگی پائی جاتی ہے۔ اُن کے ایک مشہور افسانوں مجموعے 'نازو' میں کچھ چٹکلے موجود ہیں اور اس کے علاوہ اس میں سادگی پائی جاتی ہے۔ اس مجموعے میں صرف دو افسانے ایسے ہیں جو سطحی رومانویت سے آزاد ہیں۔ باقی کے تمام افسانوں میں سطحی رومانیت کا عنصر کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اختر انصاری اپنے کچھ افسانوں میں ترقی پسندانہ خیالات کی مخالفت کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ "جنگ آزادی کا سپاہی بننا آسان کام نہیں ہے، بنسن میاں اس کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان میں ان کی نمائندہ افسانہ "زینت" نومبر ۱۹۵۸ء ہمایوں میں چھپا ہے۔

کرشن چندر کے افسانوی سفر کا آغاز بالائی پنجاب اور کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں میٹھے خوابوں سے ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے میں سختی اور طنز سامل ہو گئی۔ کرشن کے افسانوں کا مزاج غنائی تھا اور اس کے علاوہ تخلیقی بھی تھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ طلسم خیال ہے۔ جس میں رومانیت کی مٹھاس اور کسک پائی جاتی ہے۔ اس مجموعے کا ایک افسانہ صرف " ایک آئینہ "ایک ایسا افسانہ ہے جہاں سماجی تضادات اور ایک طبقے کی محرومیوں کے اسباب پر غور فکر دیتا دکھائی دیتا ہے۔ کرشن چندر کے سینکڑوں افسانے ایسے ہیں جو رومانوی ہیں۔ بے رحم حقیقت نگاری بھی ان کے افسانوں میں پائی جاتی ہے۔ ان میں ایسے افسانے بھی ہیں جو لذتیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے افسانے بھی ہیں جو زندگی کی بصیرت سے مالا مال ہیں۔ ان کے افسانے پیچیدہ نہیں اور نہ ہی ان کے کرداروں میں غیر ارضی اور خلائی اوصاف ہیں۔ ان کے نمایاں افسانے جو ہمایوں کی زینت بنے وہ درج ذیل ہیں۔

"جہلم میں ناؤ پر" جنوری ۱۹۳۷ء "مجھے کتے نے کاٹا" اپریل ۱۹۳۷ء "تالاب کی حسینہ" نومبر ۱۹۳۷ء، "بد صورتی" مئی ۱۹۳۸ء "دو فرلانگ لمبی سڑک "اکتوبر ۱۹۳۸ء، بے رنگ دیو" جنوری ۱۹۳۹ء، "پل" مارچ ۱۹۴۰۱ء، "شعلہ بے دور"، جنوری ۱۹۴۴ء، "ایک مگرمچھ ایک سا" جنوری ۱۹۵۵ء۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ کسی لوک کہانی کی تخلیق نو ہو رہی ہے اور دوسرے پنجاب کی جانی پہچانی دنیا اور دوزخ کا نقشہ بھی نظر آتا ہے۔ احمد ندیم کے کچھ افسانوں میں احساس رقابت کو موضوع بنانے کی کوشش کی گئی۔ بعض افسانوں میں افسردہ اور ملول رومانیت موجود ہے۔ ایسے افسانوں کے آخر میں ایک نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا سب سے بڑا افسانوی مجموعہ "کپاس کا پھول ہے" میں محرکات نسوانی کے بیان کی لذت انسان دوست لہجے پر چھا جاتی ہے۔ ندیم کے افسانوں میں اجتماعی زندگی کے اجزا اپنے زمینی خصائص اور نظام نسبتی کے ساتھ آئے ہیں۔ ندیم کے دیہات میں 'پن کھٹ'، محبت، سادگی ایثار، لوک کہانیوں کا طلسم بھی بولتا ہے اس کے علاوہ نمبر دار زمیندار، تھانے دار، جبر، تشدد، شرفِ آدمیت کی پامالی عصمت دری انتقام اور لالچ بھی نظر آتا ہے۔ ندیم کے افسانوں میں شہری معاشرت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ندیم کے افسانوں میں ذہنی پختگی پائی جاتی ہے۔ ان کے نمایاں افسانے جو ہمایوں کی زینت بنے وہ درج ذیل ہیں۔

"مسافر" جولائی ۱۹۳۸ء، "آرام" دسمبر ۱۹۳۸ء، "ننھے نے سلیٹ خریدی" جون ۱۹۳۹ء "قلی" جولائی ۱۹۴۰ء، "خربوزے" مارچ ۱۹۴۲ء، "من کی ڈالی" اپریل ۱۹۴۳ء، "ارتقاء" جنوری ۱۹۴۶ء، "تکمیل" نومبر ۱۹۴۶ء، "پرمیشر سنگھ" جنوری ۱۹۵۳ء، "موچی" جنوری ۱۹۵۴ء

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.2 2021

ابو سعید کے افسانوں میں زیادہ تر سیاسی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانوں میں قوم پرستی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بھارت میں اردو اور مسلمانوں سے کیے جانے والے سلوک اور فرقہ پرستوں کے طرز عمل پر اپنی بے خوفی کا اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ عصمت نے دہشت پسندوں کے خلاف سرکاری مہم کی بے رحمی اور دشمنی کے خلاف سخت آواز اٹھائی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد ملتی ہے۔ ہمایوں میں اُن کا افسانہ "بوڑھا کنجوس" کے نما سے مئی ۱۹۳۵ء میں چھپا ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں جذباتی مثالی اور سطحی انداز پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے افسانوں میں غربت محرومی معاشی استحصال سیاسی دیوالیہ پن یا نفس پرستی کے خلاف اپنے غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بہت سے افسانوں کا آہنگ اتنا تیز اور بلند ہے کہ کسی پُرجوش ادیب کی تخلیقات محسوس ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان کا پہلا افسانہ ابابیل حیرت انگیز طور پر توازن اور اعتدال کے اجزا اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان کے ایک اور افسانے ایک "پائیلی چاول" کی بہت سے ناقدین نے بہت تعریف کی۔ ان سے افسانوں میں زیادہ تر فطری اور بے ساختہ رنگ دکھائی دیتا ہے۔ ان کا ایک افسانہ "مادر زاد" کرشن چندر اور ندیم کے ان یادگار افسانوں کے ساتھ رکھنے کے قابل ہے۔ جن میں طبقاتی امتیاز کو قسمت کا لکھا ماننے والا باپ ہی نہیں بلکہ اسے یاد آنی والی کہاوتیں بھی ہیں۔ "معجزہ" اکتوبر ۱۹۵۰ء

سعادت حسین منٹو کے افسانوں میں حق، انصاف، بے باکی اور ریاکاری کے خلاف للکار پائی جاتی ہے۔ منٹو کے افسانوں کا لب ولہجہ بھی جذباتی ہے۔ مگر فسادات سے متعلق یہ منٹو کے نقطہ نظر کا براہ راست اظہار ہے۔ منٹو تخلیقی عمل میں فارمولوں کی حکمرانی کا قائل نہیں تھا وہ انسانوں کو وقتی اور ہنگامی اخلاقی یا سیاسی مقاصد کے تابع بھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جانتا تھا کہ بڑے سے بڑے سانحہ کا ادبی اظہار بے درد معروضیت کا تقاضا ہے اس لیے فسادات سے متعلق منٹو کا عمومی رویہ سطحی جذباتی یا ہنگامی نہیں۔ کوئی بھی صاحب نظر منٹو کے ہاں یہ بات بھی نوٹ کر سکتا ہے کہ سکھوں پر لکھتے وقت وہ فن کی بلندیوں کو چھو لیتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ان کے کلچر اور عادات سے واقف ہے بلکہ ان کی روح میں اترنا جانتا ہے۔ ہمایوں میں چھپنے والے ان کے افسانے "جادوگر" دسمبر ۱۹۴۳ء، "سیاہی اور عورت" جنوری ۱۹۲۴ء، "چھبیس مزدور ایک دوشیزہ" اگست ۱۹۲۴ء "طاقت کا امتحان" مارچ ۱۹۲۵ء، "ماں" مئی ۱۹۳۵ء، "راز روس اور اسکے وزراء کے نام کھلی چھٹی"، مئی ۱۹۲۵ء، "تین روزی کہانیاں" مئی ۱۹۳۵ء، "ایثار" مئی ۱۹۳۵ء "دست بریدہ بھوت" اکتوبر ۱۹۳۵ء، "شقل" مئی ۱۹۳۸ء، "نیا قانون" جنوری ۱۹۴۸ء، "خودکشی کا اقدام" جولائی ۱۹۳۸ء، "منتر" فروری ۱۹۳۹ء شائع ہوئے ہیں۔

عزیز احمد نے اردو افسانے کو بالکل نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ ان کے عہد تک افسانہ کے تین خاص رنگ اور رویے تھے۔ ایک رومانی جس کی نمائندگی یلدرم، نیاز اور مجنوں کر رہے تھے۔ دوسرے اصلاحی جس کے بانی اور علمبردار پریم چند اور ان کے ہمنوا تھے۔ تیسرے نظریاتی جسے آگے بڑھانے اور مقبول عام بنانے میں احمد علی اور سجاد ظہیر وغیرہ پیش پیش تھے۔ عزیز احمد نے الگ اپنی راہ نکالی۔ انہوں نے اجتماعی زندگی کو فرد کے حوالے سے یعنی جز میں کل کو دیکھنے دکھانے کا تجربہ کیا۔ اور مطالعہ ومشاہدہ کی مدد سے اردو افسانے کو بلحاظ پلاٹ اور کردار مشرق ومغرب کے تہذیب رویوں کا سنگم بنا دیا۔ عزیز احمد نے اپنے افسانوں میں رومانویت کے ساتھ تلخ سماجی حقائق کا احساس بھی بھرپور انداز میں دکھایا۔ ہمایوں میں "کوکو" اکتوبر ۱۹۳۱ء، "بیوفا عورت" فروری ۱۹۴۶ء کو شائع ہوئے۔

راجندر سنگھ بیدی پریم چند کے بعد اردو افسانے کو فکری وفن کی وسیع تر کائنات سے جوڑنے والوں میں بیدی نمایاں نظر آتے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے بیدی کے دو افسانوی مجموعے قارئین اور ناقدین کے ایک وسیع طبقے کی توجہ جذب کر چکے تھے۔ اپنے ان افسانوں میں عموماً بیدی کا رویہ دیگر ترقی پسند یا پیش قدم ادیبوں سے مماثل نظر آتا ہے وہ بھی تلخی سے سماجی امتیازات کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے ہاں بھی غریب اپنی اکھڑی ہوئی سانسوں کو بھی گروی رکھنے کی فکر میں مبتلا ملتے ہیں۔ بیدی کے ہاں بھی بوڑھے بیمار اور کمزور کسمپرسی کے عالم میں جان دیتے ہیں افلاس چہروں کو نہیں روحوں کو بھی مسخ کر دیتا ہے۔ اور اس اندھیرے میں خلوص چہرہ پہچانا نہیں جاتا۔ مگر حقیقت میں بیدی کے ان افسانوں میں بھی وہ نفسی رمزیت موجود ہے، جو بعد کو بیدی کی سب سے بڑی شناخت بنی وہ انسانی رشتوں اور رویوں کے بطن میں جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ ہمایوں میں "کوارنٹین" جون ۱۹۳۸ء کو شائع ہوا۔

بلونت سنگھ کے یہاں عموماً حقیقت نگاری کا رویہ ہے، دوسرے ندیم کے کرداروں میں شرمیلا پن اور لطاف ہے۔ جب کہ بلونت سنگھ پنجاب کی زندگی کے کھردرے پن کو بھی پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بلونت سنگھ کے افسانوں میں محض اشیاء کے نام یا گردوپیش کی تفصیل نہیں بلکہ اس کے کردار اپنی مخلصانہ اور وسیع القلبی کے ساتھ ساتھ اپنے لچرپن کی وجہ سے زیادہ جاندار دکھائی دیتے ہیں۔ بلونت کے افسانوں میں محض پنگھٹ، میلے اور ملاقاتیں ہی نہیں نہ محض گیت اور گالیاں بلکہ فہم جوئی مردانہ کھیل جنسی طلب اور زمین کی خوشبو اور رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی زمین اور زمین کے کھرے نمائندے سکھ جاٹ کے مزاج رویے اور طور طریقوں کے بارے میں اعتماد اور تنیقس سے بات کرتا ہے اور اکثر ثابت ہوتا ہے کہ اس معاشرے کے بارے میں اس کا تجربہ نہایت وسیع ہے۔ ہمایوں میں ان کا نمائندہ افسانہ "پاسٹ" جنوری ۱۹۴۶ء کو شائع ہوا۔

دیوندر ستیارتھی کی طرح بعض دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی مختلف علاقوں کی معاشرتی وثقافتی مہک کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہندوستان کا مشرق، مغرب، شمال اور جنوب، کشمیر کرناٹک، پنجاب، اڑیسہ، آندھرا پردیش، بنگال، تامل ناڈو اور راجپوتانہ اپنے باسیوں گیتوں اور موسموں کے رنگوں کے ساتھ ستیارتھی کے افسانوں میں جس طرح جذب ہوتے ہیں میں نے اردو افسانے میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں دیکھی۔ مختلف علاقوں کے گیت کسی چمکتی دمکتی محفل موسیقی کی دین نہیں اور نہ ہی یہ ایئر کنڈیشنڈ ریکارڈنگ روم میں پروان چڑھتے ہیں یہ فطرت کی آغوش میں پلنے والوں کی کامرانیوں اور محرومیوں، وعدوں اور دلاسوں، امیدوں اور مایوسیوں کی ایسی روداد ہیں جنہوں اپنے نگار خانہ جات میں سمیٹنے کی خاطر ستیارتھی نے مفلسی اور دربدری سے یاری لگائی۔ ستیارتھی کے افسانوں میں رنگوں کا ذکر نفسیاتی معنویت اور اشاریت پیدا کرتے ہیں۔ ہمایوں میں شائع ہونے والے افسانے "جوڑا سانکھو" فروری ۱۹۴۵ء، "اور بھگوان نہیں رہا تھا" دسمبر ۱۹۴۵ء، "دور رہا" جنوری ۱۹۴۶ء، "امن کا ایک ایک دن" فروری ۱۹۴۷ء، "دو کہانیاں" فروری ۱۹۴۱ء، "اکنی" اگست ۱۹۴۱ء، "دو پیشے" مئی ۱۹۴۲ء، "میری کہانی کا ایک ورق" جون ۱۹۳۹ء، "اگلے طوفانِ نوح تک" فروری ۱۹۴۴ء، "مل کر پھنسو مچھلیو" جون ۱۹۴۴ء، "پٹائی کے دنوں میں" اگست ۱۹۴۴ء۔

جلیس ابراہیم افسانہ نگار کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔ وہ تجریدی یا فرضی معاشروں کی طرف نگاہ تخلیق نہیں اٹھاتے ہیں بلکہ اپنی سرزمین اپنے شہر کے گلی کوچوں میں بکھری ہوئی آہوں اور سسکیوں کو سمیٹتے ہیں۔ پھر ایسا بھی نہیں کہ گردوپیش صرف آہیں اور سسکیاں ہی ہوں ان میں وہ زندہ وجود بھی ہیں جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ رفاقت خلوص، ایثار اور اقدار حیات کے موسموں میں پروان چڑھتے ہیں۔ ہمایوں میں ان کے افسانے "آنسو جو بہہ نہ سکے" مئی ۱۹۴۷ء میں چھپے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.5 No.2 2021

ابو جلیس نے اپنے انشائیوں میں زمانہ قدیم کو جدید زمانے سے ملانے کی کوشش کی ہے۔ان کی تحریروں میں شوخی اور سادگی پائی جاتی ہے۔جو کہ اپنی مثال آپ ہے۔اور یہی ان کی خاصیت ہے۔ ان کی تحریروں میں ظرافت کا عنصر بہت کم پایا جاتا ہے۔مگر اس سے بوریت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ان کے ہمایوں میں سرگوشیاں" مارچ۱۹۲۹ءاور سرگوشیاں " اپریل۱۹۲۹ءشامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز شیریں،"معیار"،ص ۱۳۹
۲۔ علی سردار جعفری،"ترقی پسند ادب"،ص۲۷
۳۔ کرشن چندر، "نئے زاویے"، تمہید
۴۔ بشیر احمد،"بزم ہمایوں"،شمارہ جنوری۱۹۴۴ء
۵۔ انجمن کی پہلی کانفرنس(لکھنو،اپریل۱۹۳۶ءمیں منظور ہوا)
۶۔ عندلیب شادانی،" ایک تابناک ستارا "،ساقی(دہلی)
۷۔ احسن کلیم،"اختر انصاری کی شاعری "،آج کل ۱۵،فروری۱۹۴۵ء
۸۔ "نئے ادب کے معمار"،مجاز،از عصمت چغتائی
۹۔ عزیز احمد،" ترقی پسند ادب"،ص۱۳۰
۱۰۔ "نیا دور"،بنگلور نمبر۸مجاز کی شاعری،از اختر انصاری
۱۱۔ "مجاز کی رومانوی شاعری"،احتشام حسین،نیاور کراچی،شمارہ۳،۴
۱۲۔ "مجاز کی رومانوی شاعری"،احتشام حسین،نیاور کراچی،شمارہ۳،۴
۱۳۔ "آہنگ دیباچہ"،فیض احمد فیض
۱۴۔ مجاز،رومانیت کا شہید- آل احمد سرور،علی گڑھ،میگزین،مجاز نمبر۱۹۵۶
۱۵۔ "مجاز،اردو ادب کا افسانہ"،محمد حسن عسکری،نیا دور نمبر۳،۴
۱۶۔ فراق کے خطوط،بنام محمد طفیل،نقوش لاہور،جولائی،اگست ۱۹۵۴
۱۷۔ "فکر و نظر ۱۹۵۴"،شمارہ نمبر۱،جدید غزل،از رشید احمد صدیقی
۱۸۔ "اردو شاعری میں فراق کی آواز"محمد حسن عسکری،انسان اور آدمی،ص۲۴۱
۱۹۔ "فراق کی نظمیں"عزیز احمد،نیا دور(بنگلور)نمبر۱۰
۲۰۔ ابلیس رات کے سناٹے میں،احمد ندیم قاسمی،ہمایوں،شمارہ اپریل ۱۹۴۴ء
۲۱۔ ابلیس،ہمایوں،شمارہ اپریل ۱۹۴۴ء
۲۲۔ نیا نظام،یوسف ظفر،ہمایوں شمارہ اگست ۱۹۴۴ء
۲۳۔ صبح نو،سیف الدین سیف،ہمایوں،شمارہ اپریل ۱۹۴۴ء
۲۴۔ ہمایوں شمارہ،جنوری/جون،۱۹۴۴ء